امجد اسلام امجد
فشار

نام :

امجد اسلام امجد

تاریخ پیدائش :

۴ - اگست ۱۹۴۴ - لاہور

تعلیم :

ایم - اے (اردو)

ملازمت :

ستمبر ۶۸ء تا اگست ۷۵ء :

استادِ شعبۂ اردو، ایم اے او کالج لاہور

اگست ۷۵ء تا اگست ۷۹ء :

ڈپٹی ڈائرکٹر، پنجاب آرٹ کونسل، لاہور

اگست ۷۹ء تا حال :

استاد شعبۂ اردو گورنمنٹ ایم اے او کالج، لاہور

فشار

باذوق لوگوں کے لیے
ہماری کتابیں
خوبصورت کتابیں

فشار

امجد اسلام امجد

ماورا پبلشرز — ۳ بہاولپور روڈ، لاہور

ادارہ : ماورا پبلشرز
طبعِ اوّل : دسمبر ۱۹۸۲ء
تعداد : ایک ہزار
نگرانِ اشاعت : خالد شریف
قیمت : تیس روپے

عطاء الحق قاسمی کے نام

ترتیب

—

منظوم ڈرامہ

فشارِ آرزو

"برزخ" اور "ساتواں در" کے بعد یہ میرا تیسرا شعری مجموعہ ہے، جو آپ تک پہنچ رہا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں مختلف مصروفیات، خصوصاً ڈرامہ نویسی کی وجہ سے میرے دوستوں کی طرف سے اکثر اس خدشے کا اظہار کیا گیا ہے کہ کہیں اِس سے میری شاعری کے معیار اور مقدار پر اثر نہ پڑے۔ معیار کا فیصلہ تو قارئین کا کام ہے البتہ مقدار کے ضمن میں صورتِ حال خاصی بدل گئی ہے۔ آپ اِس کتاب میں مختلف تخلیقات کے درمیان طویل وقفے پائیں گے لیکن عجیب بات ہے کہ اب شاعری مجھ پہ اگرچہ تسلسل سے وارد نہیں ہوتی، مگر چھ، سات، آٹھ ماہ کے وقفے کے بعد جب بھی طبیعت رواں ہو تو تین چار چیزیں ایک ساتھ ہو جاتی ہیں یعنی آخری نتیجہ خاصا امید افزا ہے۔

اپنے شعری رویے اور نظریۂ فن کی وضاحت چونکہ گزشتہ دونوں کتابوں کے ابتدائیوں میں، کر چکا ہوں، اور اگرچہ یہ نقش باطل نہیں، پھر بھی تکرار کو لاحاصل جانتے ہوئے اس سے صرفِ نظر کرتا ہوں۔ یہاں صرف ایک بات اپنے پڑھنے والوں سے کرنا چاہتا ہوں۔

یہ دنیا بڑی پر اسرار، بڑی کمینی اور بڑی خوبصورت ہے۔ آپ کی

طرح میں بھی اس Paradox کے تجربے میں ششدر رہتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہر چیز دوسری چیز پر سپرامپوز (Super impose) اور ہر آواز پر اوورلیپ (Over Lap) ہو رہی ہے۔ اشیا کی شکلیں اور ان کے معنی دھنک کے رنگوں کی طرح بننے اور تحلیل ہونے کے ایک مسلسل عمل میں مبتلا ہیں۔ میں جو کچھ شعروں میں لکھتا ہوں وہ حقیقت ہے یا عکسِ حقیقت اس کا فیصلہ شاید کبھی نہ ہو سکے۔ لفظ، خیال، تمثال اور پیرایہ۔ یہ سب کس اصول کے تحت شاعری میں ڈھلتے ہیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں مجھے اس کا کچھ علم نہیں۔ کچھ نقادوں اور مختلف علوم کے ماہرین نے تخلیقی عمل کے ضمن میں بہت موٹی موٹی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے کچھ کو میں نے (بڑی مشکلوں سے) پڑھا ہے۔ کچھ باتیں دماغ کو اپیل بھی کرتی ہیں لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ یوں لگتا ہے جیسے آئس برگ کی طرح تخلیقی عمل کا بھی شاید صرف دسواں حصہ ہی سطح پر نظر آتا ہے۔ اصل حقیقت کچھ اور ہے۔ ہمارے فہم و ادراک سے بہت بڑی — بہت پراسرار!!

آواز، لفظ، زبان اور اسلوب، شعری اظہار کے بنیادی عناصر ہیں لیکن کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ ان چاروں عناصرِ ترکیبی سے ماورا، ان سے مختلف، کوئی بالکل الگ سی چیز ہے۔ میں اُسے محسوس کر سکتا ہوں لیکن لفظوں میں وہ لفظ، رنگوں میں وہ رنگ، لمسوں میں وہ لمس اور خوشبوؤں میں وہ خوشبو شاید میری پہنچ سے باہر ہے یا شاید وہ ہے ہی نہیں! مر چکی ہے یا شاید ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی —!

سو جو کچھ آپ میری شاعری میں دیکھیں گے، یہ زندگی کے ساحل کا صرف

وہ رستہ ہے جو میں دیکھ سکا ہوں — یہ سب کچھ بصارت کے اِسی گمان کا منظر نامہ ہے — پتہ نہیں کیوں، جب بھی میں کسی بڑے لکھنے والے کو پڑھتا ہوں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مجھ سے بڑا، بہت بڑا سہی، لیکن وہ بھی اسی آشوب میں مبتلا تھا ..... شاید یہی گمانِ بصارت تخلیقی عمل کا بنیادی جوہر ہے!

— کسی ستم ظریف کا قول ہے!

"ضمیر کی آواز آپ کو گناہ سے روک تو نہیں
پاتی، مگر اُس کا مزہ خراب کر دیتی ہے۔"

کم و بیش یہی قصہ روشنیٔ طبع کا ہے — یہ بھی رستہ تو نہیں دکھاتی البتہ گمرہی کا احساس اور شعور بڑھا دیتی ہے — شیخ سعدیؔ نے اگر اسے 'بلا' کہا تھا تو بالکل بجا کہا تھا — اس کے باوجود یا شاید اسی کی وجہ سے میں اُس ذاتِ بے نہایت کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے شعر کہنے کی قوت عطا کی — سوچتا ہوں اگر روح میں یہ کھلی ہوئی کھڑکی نہ ہوتی تو کتنا حبس ہوتا —

امجد اسلام امجد

۱۸ - اگست ۱۹۸۲ء

حمد

سب ناموں کا مالک سب کے دُکھ کا چارا ہے
ہر بستی پر روشن جو بے نام ستارا ہے

ریگِ رواں کی وحشت میں بھی ایک نشانی ہے
دریا کے سنّاٹے میں بھی ایک اشارہ ہے

حدِّ ازل سے حدِ ابد تک اس تاریکی میں
بام تمہارا روشن تھا یا نام تمہارا ہے

اتنی بڑی اِن دنیاؤں میں کتنا بے مایہ!
بڑے خسارے میں ہوں بیشک، بڑا خسارا ہے

ہر رستے کی منزل ہے وہ، ہر منزل کی رہ

اِس تاریک خلا میں کیسا عجب ستارا ہے

ق

اے آنکھیں اور آنکھوں کو یہ نیندیں دینے والے

میں نے ہر اک خواب میں چھپ کر تجھے پکارا ہے

تاروں کی پوشاک پہن کر رات سجانے والے

سورج تیرے حسنِ ازل کا ایک اشارا ہے

اے حرفوں اور آوازوں کو شکلیں دینے والے

تیرے حرفوں، آوازوں نے تجھے پکارا ہے

کیسے بندے ہیں وہ امجد جو یہ سوچتے ہیں

مولا، سب دنیا کا نہیں ہے، صرف ہمارا ہے

نعت

اُن کے دامن کی بات کی جائے
کوئی شکلِ نجات کی جائے

آپ کے سایۂ عطا میں بسر
زندگی کی یہ رات کی جائے

آپ کے لطف و اِعتنا کی نظر
رہبرِ شش جہات کی جائے

آرزو کی زبان میں لکھ کر
آپ کی بات بات کی جائے

آپ کے اِسم سے عبارت ہو
جو بھی سعیِ ثبات کی جائے

آپ کے دم سے صبح جاری ہو
آپ کے غم سے رات کی جائے

کر کے دھڑکن کا آئنہ روشن
کملی والے کی بات کی جائے

منہ میں جب تک زبان ہے باقی
آپ ہی کی صفات کی جائے

ذکرِ احمدؐ کی ایک اِک ساعت
حاصلِ کائنات کی جائے

آپ سے آگہی کی شرط ہے یہ
پہلے تسخیرِ ذات کی جائے

سائے جس سمت بھی بڑھیں امجد
روشنی ساتھ ساتھ کی جائے

دُعا

مولا۔ اِس بستی کی آنکھیں کب تک سپنے دیکھیں
ایسا بھی اک سُورج، جس میں، چہرے اپنے دیکھیں

رُت آئے رُت جائے مولا، خالی اپنے ہاتھ
ہر موسم میں پچھلی رُت کے زخم چلے ہیں ساتھ
اِن زخموں کی خوشبُو میں ہیں جینے کے ارمان
آٹھ کروڑ انسان
اِس بستی کی خاک ہمارے ہونے کی پہچان
جینے کا سامان

تیرے عرشوں سے اب ہم پر ہُن برسے یا کال
مولا ہم بے نام پرندے، کیسے چھوڑیں ڈال!

ہم ایسے مرگ طلب بھی نہ تھے محبّت میں

ہم ایسے مرگ طلب بھی نہ تھے محبّت میں
کہ جلتی آگ کے دریا میں بے خطر جاتے
(یقین جان، مری جان کہ ہم ٹھہر جاتے)

تمھاری آنکھ کے آنسو تھے، سیلِ آب نہ تھا
چھلک بھی جاتے اگر، رزقِ خاک ہو جاتے
(مثالِ قطرۂ شبنم، چمکتے، کھو جاتے)

رہا وہ حرفِ وفا جس کی سبز کونپل پر
تمہارے بوسۂ لب سے گلاب جاگے ہیں
(سو وہ گلاب تو کونپل سے کٹ بھی سکتے ہیں)
رہے وہ خواب جو آنکھوں کے آبگینوں ہیں
دھنک کے رنگ لیے ڈولتے سے رہتے ہیں
(سو ایسے خواب تو آ کر پلٹ بھی سکتے ہیں)

سو بات حرفِ وفا کی ہے اور نہ خوابوں کی
نہ ڈولتے ہوئے رنگوں سے پُر گلابوں کی
سمے کے چڑھتے اُترتے ہوئے سمندر میں
سب ایک پل کی حقیقت
سب ایک پل کا سراب!
دلوں میں ترکِ تمنّا کا حوصلہ ہو اگر
تو کیسا حرفِ وفا!
اور کہاں کے خواب و گلاب!!

یہ کیسے دشتِ ندامت میں گھِر گئے اے جاں
کہ اک تو ترکِ تمنّا کا حوصلہ بھی نہیں

اور اس پہ یہ بھی قیامت

اگر — بفرضِ محال

تمھاری راہ سے پھرنے کا حوصلہ بھی ملے!

پلٹ کے جائیں کہاں، گھر کا راستہ بھی ملے!!

○

غبارِ دشتِ طلب میں ہیں رفتگاں کیا کیا
چمک رہے ہیں اندھیرے میں استخواں کیا کیا

دِکھا کے ہم کو ہمارا ہی قاشِ قاشِ بدن
دلاسے دیتے ہیں دیکھو تو قاتلاں کیا کیا

گھٹی دلوں کی محبت تو شہر بڑھنے لگا
مٹے جو گھر تو ہویدا ہوئے مکاں، کیا کیا

پلٹ کے دیکھا تو اپنے نشانِ پا بھی نہ تھے
ہمارے ساتھ سفر میں تھے ہمرہاں کیا کیا

فشار

۲۴

ہلاکِ نالۂ شبنم، ذرا نظر تو اُٹھا
نمُود کرتے ہیں عالم میں گُل رُخاں کیا کیا

کہیں ہے چاند سوالی، کہیں گدا خورشید
تمہارے در پہ کھڑے ہیں یہ سائلاں کیا کیا

بچھڑ کے تجھ سے نہ جی پائے، مختصر یہ ہے
اس ایک بات سے نکلی ہے داستاں کیا کیا

ہے پُر سکون سمندر، مگر سنو تو سہی
لبِ خموش سے کہتے ہیں بادباں کیا کیا

کسی کا رختِ مسافت تمام دھوپ ہی دھوپ
کسی کے سر پہ کشیدہ ہیں سائباں کیا کیا

نکل ہی جائے گی اک دن مدار سے یہ زمیں
اگرچہ پہرے پہ بیٹھے ہیں آسماں کیا کیا

فنا کی چال کے آگے کسی کی کچھ نہ چلی
بساطِ دہر سے اُٹھے حساب داں کیا کیا

کسے خبر ہے کہ امجد بہار آنے تک
خزاں نے چاٹ لیے ہوں گے گلستاں کیا کیا

ہری بھری اِک شاخِ بدن پر

ہری بھری اِک شاخِ بدن پر
میرے لبوں کے لمس سے پھوٹے
ایسے ایسے پھول
سادہ سے ملبوس میں بھی وہ ساتوں رنگ کھِلاتی ہے
اپنے حُسن کی تیز مہک سے
لوگوں کے انبوہ میں بیٹھی یوں گھبرا سی جاتی ہے
جیسے باتیں کرتے کوئی!
جاتا ہے کچھ بھول
میرے لبوں کے لمس سے پھوٹے
ہری بھری اک شاخِ بدن پر
کیسے کیسے پھول!

جب آنکھیں بجھ کر راکھ ہُوئیں

جب آنکھیں بجھ کر راکھ ہُوئیں
جب دل کا جوالا سرد پڑا
جب شام و سحر کے صحرا میں
خوابوں کے ستارے ریت ہُوئے
جب عمرِ رواں کے میداں میں
سب زندہ جذبے کھیت ہُوئے

اُس وقت مجھے محسوس ہُوا
"جس عشق میں ساری عمر کٹی شاید وہ نظر کا دھوکا تھا
کرنوں سے کسی کے لہجے میں تنویر تھی میری اپنی ہی
شب تاب بدن کے جادو میں خود میرے لہو کا نشہ تھا"

کل رات مگر جب کھڑکی پہ
مہتاب نے آ کر دستک دی
خوشبو کی طرح لہرانے لگی
ہر سمت کوئی سرگوشی سی

"جب آنکھیں بجھنے لگتی ہوں، جب دل کا جوالا سرد پڑے
اُس وقت کسی کو کیا معلوم، کون اپنا کون پرایا تھا
لہجے میں نشہ تھا کس کے سبب اور کس نے کسے مہکایا تھا"

○

پسپا ہُوئی سپاہ تو پرچم بھی ہم ہی تھے
حیرت کی بات یہ ہے کہ برہم بھی ہم ہی تھے

گرنے لگے جو سُوکھ کے پتّے تو یہ کھُلا!
گلشن تھے ہم جو آپ تو موسم بھی ہم ہی تھے

ہم ہی تھے تیرے وصل سے محروم عمر بھر
لیکن تیرے جمال کے محرم بھی ہم ہی تھے

منزل کی بے رُخی کے گِلہ مند تھے ہمیں
ہر راستے میں سنگِ مجسّم بھی ہم ہی تھے

اپنی ہی آستیں میں تھا خنجر چھپا ہُوا
امجدؔ ہر ایک زخم کا مرہم بھی ہم ہی تھے

مشورہ

لذیذ ہو تو حکایت دراز تر بھی کروں
زوال کی ہے شکایت سو اس زمانے میں
ہے کون جو اِسی دولت سے بہرہ مند نہیں
دہانِ خشک سے تلخی ملے گی، قند نہیں

تو آؤ آج سے یہ رسمِ گفتگو چھوڑیں
عنانِ وقت کو تھامیں خود اپنے ہاتھوں میں
بہت نہیں تو ذرا سا ہی اس کا رُخ موڑیں!

گلیڈی ایٹرز

(GLADIATORS)

ہم اپنے قتل ہونے کا تماشا دیکھتے ہیں
تو اپنی تیز ہوتی سانس کے کانوں میں کہتے ہیں
"ابھی جو ریت پر لاشہ گرا تھا
میں نہیں تھا — !
میں تو زندہ ہوں — یہاں
دیکھو،
مری آنکھیں، مرا چہرہ، مرے بازو،
سبھی کچھ تو سلامت ہے" !!

(۲)

ابھی کل ہی کا قصّہ ہے
سرِ مقتل ہمارے دست و بازو کٹ رہے تھے
پہ ہم اپنے گھروں میں مطمئن بیٹھے ہُوئے
ٹی وی کے قومی نشریاتی رابطے پر
سارے منظر دیکھتے تھے
اور یہ کہتے تھے
"نہیں یہ ہم نہیں ہیں"
ہماری آستیں پر خون کے دھبّے ابھی تازہ ہیں
سُوکھے بھی نہیں!

خوابِ سراب

اب جو سوچیں بھی تو خوف آتا ہے،
کس قدر خواب تھے جو خواب رہے
کس قدر نقش تھے جو نقشِ سراب رہے
کس قدر لوگ تھے جو
دل کی دہلیز پہ دستک کی طرح رہتے تھے
اور نایاب رہے!

کس قدر رنگ تھے جو
بند کلیوں کے خم و پیچ میں چکراتے رہے
اپنے ہونے کی تب و تاب میں لہراتے رہے

پر کبھی آپ سے باہر نہ ہُوے
پھُول کے ہاتھ پہ ظاہر نہ ہُوے!
دل کے گرداب میں ٹوٹے ہُوے پتّوں کی طرح
ہمہ تن رقص رہے
خون کے سرخ میں بے نام ستاروں کی طرح
عکس در عکس رہے!

کیسے آدرش تھے جن کے سائے
سنسناتے ہُوے تیروں کی طرح چلتے تھے
ہست اور نیست کے مابین عجب رشتہ تھا
روح کی آگ بھڑکتی تو بدن جلتے تھے!

وہ شب و روز تھے کیا،
جب کسی خواہشِ بیدار کی طغیانی میں

وقت کی قید سے لمحات نکل جاتے تھے
خون میں جب بھی سلگتا تھا ارادہ کوئی
آہنی طوق، تمازت سے پگھل جاتے تھے!

(۲)

آنکھ کے دشت میں اب لاکھ الاؤ دہکیں
رُوح کی برف پگھلتی ہی نہیں
اب وہ آدرش کبھی
وقت کی اوٹ سے جھانکیں بھی تو یوں جھانکتے ہیں
جس طرح ٹوٹتا تارا کوئی
ایک لمحے کے لیے کوند کے چھُپ جاتا ہے!
کس قدر خواب تھے جو خواب رہے
اب جو سوچیں بھی تو خوف آتا ہے۔

اُس رات آسمان پہ تارے تھے اس قدر

اُس رات آسماں پہ تارے تھے اس قدر
دشوار ہو رہا تھا سفر ماہتاب کا
آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کے پار
انگڑائی لے کے پھیل رہا تھا، چہار سُو
اِک بے کنار ہجر کا دشتِ چمن نما،
اٹکی ہوئی تھی نخلِ تمنا کی شاخ پر
فصلِ پریدہ رنگ کی مَسلی ہوئی قبا
اک اجنبی دعا
کھلنے لگے تھے دستِ ہوا پر خزاں کے پھول
(جاتی ہوئی بہار کے ٹوٹے ہوئے اصول)
چہرہ ازل کی آگ تھا آنکھیں ابد کی دھول

(۲)

اُس رات ٹوٹتے ہُوئے تاروں کی گونج میں
ہم کتنی دیر چلتے رہے، کچھ پتہ نہیں
کب تک ہم اپنے اَن کہے لفظوں کی کرچیاں
فرشِ ہوا سے چُنتے رہے، کچھ پتہ نہیں!

شبنم کے ساتھ ساتھ جو چمکے تمام شب
تارے تھے وہ کہ عکس مرے آنسوؤں کے تھے!
کیوں قربتوں کے شور میں گھٹنے لگا تھا دم
قسمت کے تھے کہ حلقے ترے بازوؤں کے تھے
کچھ پتہ نہیں — !

(۳)

گرد اس قدر ہے آئنۂ ماہ و سال پر
خوابوں کے عکس اپنے خد و خال کھو گئے

آنکھوں کے رنگ لے گئی تاروں کی روشنی

چہروں کے نقش ریت کی تحریر ہو گئے

تکتے تھے دل کی سمت جو قرنوں کی اوٹ سے

بے نام خواہشوں کے وہ موسم بدل گئے

سورج غروب ہو گئے مہتاب ڈھل گئے

اُس بے کنار ہجر کا دشتِ چمن نما

تمثالِ دشتِ کرب و بلا بن چکا ہے اب

طائر شہید ہو چکے، اشجار جل گئے

(۴)

یہ سچ ہے لوحِ وقت پہ تحریرِ موجِ رنگ

نقش و نگارِ آب کی صورت ہے برق پا

اِک بار پُل تلے سے جو پانی گزر گیا

سمجھو کہ مر گیا

ساحل کا جھاگ ہو کے مٹے یا کہ رزقِ ابر

آتا نہیں پلٹ کے کبھی، جو گیا۔ گیا

لیکن یہ کیا کہ آج بھی جس رات ماہتاب

تاروں کے بے کنار میں رستہ نہ پا سکے

آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کے پار

ملتی ہیں اس طرح سے زمانوں کی سرحدیں

چلتا نہیں پتہ،

ہم پیچھے رہ گئے ہیں کہ آگے نکل گئے۔!

رُو برُو

اپنے خوابوں کی دہلیز پر مضمحل
کب سے بیٹھے ہیں عشّاق
ژولیدہ مُو اور پژمردہ دل
رسمِ بخیہ گری
شہرِ کمِ رزق میں اس طرح سے بڑھی
بھُوک کے زخم بھی سلکِ ایمان سے لوگ سینے لگے
سلکِ ایمان کھنچ کھنچ کے تنتا گیا
اس قدر تن گیا

ہر گھڑی دل میں رہتا ہے یہ وسوسہ
یہ اگر ٹوٹ کے
وقت کے کپکپاتے ہُوئے ہاتھ سے چھُوٹ کے
بھُوک کے اس جہنّم کے پاتال میں گر گیا
تو یہ تنّور جس میں
شب و روز نانِ جویں کے لیے، خود بھی
نانِ جویں کی طرح سرخ شعلوں میں بنتے
بگڑتے ہیں انساں،
سلکِ ایمان کو اور اُس کے کناروں سے لپٹی ہُوئی بے اماں خلق کو
ہیزمِ خشک کی مثل کھا جائے گا ــــ

تار پر چلنے والے نٹوں کی طرح
ہم بھی تنّور کے منہ پہ تانے ہُوئے
سلکِ ایمان پر محوِ رفتار ہیں

(زندہ تاریخ بھی ایک سورج ہے پر

اُس کا نورِ جہاں تاب اُن کے لیے

ہے جو سورج مکھی کی طرح ہر نفَس

رُو بہ خورشید ہیں)

ہم کہ خود اپنی تاریخ پر بوجھ ہیں

اپنے کمزور کاندھوں پہ تاریخ کا بوجھ لادے ہوُے

(جس میں آبا کے بھوُلے ہوُے نقش ہیں

اِک حقیقت نما خواب کے عکس ہیں ــ اور کچھ بھی نہیں)

معجزوں کے لیے

اپنی آنکھوں کی جھولی پسارے ہوُے خواب اوڑھے ہوُے

آنے والے دنوں کی طرف پیٹھ موڑے ہوُے

ہیں رواں بے جہت

بے نوا اور خجل،

اپنے ہونے کے آشوب سے منفعل

رسمِ بخیہ گری

شہرِ کم رزق میں اس طرح سے پڑی
خواہشیں بے عمل
آرزو پا بہ گل
اپنے خوابوں کی دہلیز پر مضمحل
کب سے بیٹھے ہیں عشّاق
ژولیدہ مُو اور پژمردہ دل!

○

کب سے ہم لوگ اس بھنور میں ہیں!
اپنے گھر میں ہیں یا سفر میں ہیں!

یوں تو اُڑنے کو آسماں ہیں بہت
ہم ہی آشوبِ بال و پر میں ہیں

زندگی کے تمام تر رستے
موت ہی کے عظیم ڈر میں ہیں

اتنے خدشے نہیں ہیں رستوں میں
جس قدر خواہشِ سفر میں ہیں

سیپ اور جوہری کے سب رشتے
شعر اور شعر کے ہنر میں ہیں

سایۂ راحتِ شجر سے نکل
کچھ اُڑائیں جو بال و پر میں ہیں

عکس بے نقش ہو گئے امجد
لوگ پھر آئنوں کے ڈر میں ہیں

○

(نذرِ مصحفیؔ)

جب بھی آنکھوں میں ترے وصل کا لمحہ چمکا
چشمِ بے آب کی دہلیز پہ دریا چمکا

فصلِ گل آئی، کھُلے باغ میں خوشبو کے عَلَم
دل کے ساحل پہ ترے نام کا تارا چمکا

عکس بے نقش ہوئے آئنے دُھندلانے لگے
درد کا چاند سرِ بامِ تمنّا چمکا

پیرہن میں بھی ترا حسن نہ تھا برق سے کم
جب کھُلے بندِ قبا اور ہی نقشا چمکا

رُوح کی آنکھیں چکاچوند ہُوئی جاتی ہیں
کس کی آہٹ کا مرے کان میں نغمہ چمکا

رنگ آزاد ہوئے گُل کی گرہ کھُلنے ہی
ایک لمحے میں عجب باغ کا چہرا چمکا

دل کی دیوار پہ اُڑتے رہے ملبوس کے رنگ
دیر تک ان میں تری یاد کا سایا چمکا

لہریں اُٹھ اُٹھ کے مگر اس کا بدن چومتی تھیں
وہ جو دریا پہ گیا خوب ہی دریا چمکا

یوں تو ہر رات چمکتے ہیں ستارے لیکن
وصل کی رات بہت صبح کا تارا چمکا

ہجر پنپا نہ ترا وصل ہمیں راس آیا
کسی میدان میں تارا نہ ہمارا چمکا

جیسے بارش سے دُھلے صحنِ گلستاں امجد
آنکھ جب خشک ہُوئی اور بھی چہرا چمکا

○

سائے ڈھلنے، چراغ جلنے لگے
لوگ اپنے گھروں کو چلنے لگے

اِتنی پُرپیچ ہے بھنْور کی گرہ
جیسے نفرت دِلوں میں پلنے لگے

دُور ہونے لگی جرس کی صدا
کارواں راستے بدلنے لگے

اُس کے لہجے میں برف تھی لیکن
چھُو کے دیکھا تو ہاتھ جلنے لگے

راہ گم کردہ طائروں کی طرح
پھر ستارے سفر پہ چلنے لگے

پھر نگاہوں سے کٹ گئیں آنکھیں
عکس پھر آئنے بدلنے لگے

اُس کے بندِ قبا کے جادو سے
سانپ سے اُنگلیوں میں چلنے لگے

○

پردے میں اُس بدن کے چھپیں راز کس طرح!
خوشبو نہ ہوگی پھول کی غمّاز کس طرح!

طرزِ کلام اُن کا ہُوا طرزِ خاص و عام
بدلیں گے اب وہ بات کا انداز کس طرح

بدلا جو اُس کی آنکھ کا انداز تو کھُلا
کرتے ہیں رنگ پھول سے پرواز کس طرح

ق

آنکھوں میں کیسے تن گئی دیوارِ بے حسی
سینوں میں گھُٹ کے رہ گئی آواز کس طرح!

وہ حق پرست کیسے ہُوئے مصلحت پرست
نغموں سے بے لباس ہُوئے ساز کس طرح!

آنکھوں میں موم ڈال کے بیٹھیں گے کب تلک
آئنوں سے چھپائیں گے یہ راز کس طرح!

اُس کی نظر میں عکسِ تعلّق کہیں نہیں
امجد حدیثِ شوق ہو آغاز کس طرح!

○

اپنے ہونے کی تب و تاب سے باہر نہ ہُوے
ہم ہیں وہ سیپ جو آزادۂ گوہر نہ ہُوے

حرفِ بے صوت کی مانند رہے، — دنیا میں
دشتِ امکاں میں کِھلے نقشِ مصوّر نہ ہُوے

پھول کے رنگ سرِ شاخِ خزاں بھی چمکے
قیدیِ رسمِ چمن، خاک کے جوہر نہ ہُوے

تھک کے گرتے بھی نہیں، گھر کو پلٹتے بھی نہیں
نجمِ افلاک ہُوے، اُس کے طائر نہ ہُوے

اُس کی گلیوں میں رہے گردِ سفر کی صورت
سنگِ منزل نہ بنے، راہ کا پتّھر نہ ہُوے

اپنی ناکام اُمیدوں کے خم و پیچ میں گم
ابرِ کم آب تھے ہم، رزقِ سمندر نہ ہُوے

ایک خواب کے ٹوٹنے پر!

نہ کوئی حرف رہا معتبر نہ شکل کہ ہم
کسی سخن، کسی صحبت پہ افتخار کریں!
تمام آئنے دھندلا گئے ہیں شہروں میں
نہ کوئی نقش ہے سالم نہ کوئی عکس کہ ہم
کسی نظر، کسی چہرے پہ اعتبار کریں

یہ کیسے شک کا عذابِ گراں پڑا ہم پر
خجل ہوئی ہے بصیرت، بصارتیں نادم
ہر ایک حرفِ دعا، بے نوا گدا کی طرح
خود اپنے خوابِ حضوری کی بازگشت میں گم

فصیلِ لب پہ کھڑا ہے اِسی تذبذب میں

ابھی کواڑ کھُلیں گے درِ مسیحا کے !

ابھی وہ دستِ کرم ،

کھُلے کواڑ کی خندہ جبیں سے جھانکے گا،

مگر یہ خوف کہ زنجیرِ در کی جنبش بھی

ہوا کے ڈولتے لمحے کی کوئی چال نہ ہو

لہو میں چور کی صورت نقب لگاتا ہے !

کٹی ہے ایسے دھندلکوں میں زندگی اپنی

کہ صبح و شام کے تارے کا فرق یاد نہیں

ہے پُر اُمید بھی خلقت، دلوں میں خوف بھی ہے

سحر کے جال کے پیچھے شبوں کا جال نہ ہو !

کہ یہ سفر بھی شہیدِ رہِ ملال نہ ہو !

تمام شہر کی خلقت یہی دُہائی دے

رہائی دے ہمیں مولا، ہمیں رہائی دے

دلوں کی تہہ میں چھُپے بھید جاننے والے

تری نگاہ پہ روشن ہیں ایسی تحریریں

کہ جن کے حرف کسی لوح پر لکھے نہ گئے

وہ اپنے عہد میں قائم نہیں رہا لیکن

جو خواب اُس نے دکھایا ہے وہ تو سچّا تھا

ہر ایک روح کی ڈوری ہے تیری مُٹھّی میں

اُسے گھٹا کہ بڑھا یہ تری مشیّت ہے

پر اُس کے خواب کے رستوں میں روشنی رکھنا

کوئی چراغ بجھے یا جلے مگر مولا!

مرے وطن کی فصیلوں میں روشنی رکھنا

○

لہو کے پھول سرِ شاخِ انتظار کھلے
یہ کس بہار کے غنچے، پسِ بہار کھلے!

دلوں سے گردِ مسافت دھلی تو آنکھوں میں
گلِ وصال کھلے اور بے شمار کھلے

خود اپنے سامنے بے بس ہے قوّتِ تخلیق
کہ موجِ رنگ تو پتّھر کے آر پار کھلے

ہے جو بھی پھول وہ فردِ حساب جیسا ہے
گئی رُتوں میں جو بوئے تھے اب کی بار کھلے

ہوا کچھ ایسی چلی ہے سوادِ صحرا میں
خزاں کے صحن میں جیسے گلِ بہار کھلے

○

لہو میں تیرتے پھرتے ملال سے کچھ ہیں
کبھی سنو تو دلوں میں سوال سے کچھ ہیں

میں خود بھی ڈوب رہا ہوں ہر اک ستارے میں
کہ یہ چراغ مرے حسبِ حال سے کچھ ہیں

غمِ فراق سے اِک پل نظر نہیں ہٹتی
اس آئنے میں ترے خد و خال سے کچھ ہیں

اِک اور موج کہ اے سیلِ اشتباہ، ابھی
ہماری کشتِ یقیں میں خیال سے کچھ ہیں

ترے فراق کی صدیاں، ترے وصال کے پَل
شمارِ عمر میں یہ ماہ و سال سے کچھ ہیں

علموں بس کریں او یارؓ!

علم کی روشنی میرے چاروں طرف پھیلتی ہے،
اس کی عکسی شعاعیں ہر اک شے کے باطن
کو ظاہر میں تبدیل کرتی ہیں — میں
اِنکشافات کے ایک آتش فشاں کے دہانے پہ ہوں
میرے چاروں طرف دھوپ ہے!
میری اقدار کے سبز چشموں پہ صحراؤں کی ریت خیمہ فگن ہے
ہواؤں کے لہجے میں تلخی کا اعلان ہے
اور درختوں کے سائے بھٹکتے ہوئے قافلوں کے تعاقب
میں صحرا کی پہنائیوں میں کہیں کھو چکے ہیں

؎ بابا بلھے شاہ کی کافی سے لیا گیا ہے۔

جس قدر خواب تھے

گرد بادوں کی دہلیز پر سو چکے ہیں

اے خدا،

اے سمندر کی گرہوں کے عقدہ کشا

میرے چشموں سے ریگِ رواں کے یہ خیمے ہٹا

ان کو پانی سے بھر

میرے پیڑوں کو سائے کی توفیق دے

گرد بادوں کی دہلیز پر سو چکے خواب کو

اُس کی تعبیر دے

پھر ہواؤں کے لہجے میں سینوں کے در

کھول دینے کی گم گشتہ تاثیر دے

اے خدا — میرے رب!

میرے اُونٹوں کے لب، پیاس سے خشک ہیں

آسماں پر مرے نام کا کوئی بادل نہیں

اور چاروں طرف دھوپ ہی دھوپ ہے !

میری ایڑی کو بھی کوئی چشمہ جگانے کا اعجاز دے !

میرے بے صوت لفظوں کو آواز دے !

میری پتھّر مسافت کو آغاز دے !

اور اگر یہ نہیں

تو مری آنکھ کے اِس الاؤ کو بھی، خشک مٹی سے بھر

مجھے اس جہنّم سے آزاد کر

مجھے علم کے اس جہنّم سے آزاد کر — !!

اے شام گواہی دے

بوسوں کی حلاوت سے جب ہونٹ سلگتے ہوں
سانسوں کی تمازت سے جب چاند پگھلتے ہوں
اور ہاتھ کی دستک پر
جب بندِ قبا اُس کے، کھُلنے کو مچلتے ہوں!
عشق اور ہوس کے بیچ، کچھ فرق نہیں رہتا
(کچھ فرق اگر ہے بھی، اُس وقت نہیں رہتا)
جب جسم کریں باتیں، دریا بھی نہیں بہتا
میں جھوٹ نہیں کہتا
اے شام گواہی دے

آج پُورے چاند کو دیکھا تو یاد آیا مجھے

آج پُورے چاند کو دیکھا تو یاد آیا مجھے

تم بھی اُس شب

اِک چھلکتے جام کی صورت لبالب تھے

تمھارے جسم کی قوسیں

تمھارے خوبصورت جسم کی سب دلرُبا قوسیں

کچھ ایسے زاویے پر ایک لمحے کو رُکی تھیں

جس طرح، بادل کے کونے پر

لرزتے چاند کی آنکھیں،

لرزتے چاند کی ارماں بھری، حیرت زدہ آنکھیں

تمھارا حسن

اِک سیّال بجلی کی طرح

ملبوس کی شکنوں میں ایسے مضطرب تھا

چاندنی کو، اپنے ہی رنگوں سے جیسے راستہ ملتا نہ ہو

جس طرح جادو سے کوئی

سیل سے اُٹھی ہوئی اک موج کو

مدّتوں سے پیاس کی ماری ہوا میں روک دے

اور اگر تم

اپنی اُس انگڑائی میں

اُن جھیل سی گہری نگاہوں سے

فلک کی سمت کوئی آس کا طائر اُڑاتے

مسکرا کر چاند کو آواز دیتے

تو یقیں جانو وہ بادل کی فصیلیں توڑتا

ان گنت تاروں کے اس جھرمٹ کو پیچھے چھوڑتا

آسماں کی شاخ سے پرواز کرتا اور چلا آتا

تمھارے دَر پہ سائل کی طرح آواز دیتا

اور پھر عشّاق کی صف میں کھڑا

شامِ اَبد تک منتظر رہتا

کہ تم اُس کے لیے دروازہ کھولو

اور اُسے اندر بلاؤ

ہاں یقیں جانو

کہ اُس لمحے تمھارا حسن امکاں کی حدوں سے ماورا تھا

ایک زندہ معجزہ تھا،

(۲)

دم بدم بجھتے ہوئے لمحوں کے آتشداں میں

معجزوں سا حسن خاکستر ہوا،

اجنبی تارے، سحر کے کھیت میں

بارش کے بے تعبیر قطروں کی طرح مٹی ہوئے

بے ثمر جذبوں سے بوجھل چاند لکڑی کی طرح

خورشید کے تنوّر میں ایندھن بنا !

(یہ ہمارے روز و شب بھی

بے ثمر جذبوں کا ایندھن ہی تو ہیں !)

(۳)

آج پُورے چاند کو دیکھا تو یاد آیا مجھے

کیا خبر اس بیچ، کتنے چاند بے چہرہ ہُوئے

وہ جو بادل کے کنارے پر

کسی انگڑائی کی صورت میں لرزا تھا

کہاں کا تھا — کہاں ہو گا!

کہ اب تو آسماں پر اَن گنت تاروں کے جھرمٹ میں

فقط اک دائرہ ہے

ایک تنہا دائرہ ہے

جس کی وحشت سے بھری

آنکھوں کے سُونے آئینے میں

کوئی روشن عکس لہرایا نہیں

اور تا حدِّ نظر

ابر کا سایا نہیں !!

خوشحال خاں خٹک کے لیے ایک نظم

زمیں دُلہن ہے

اور افلاک کی اِن بے ٹھکانہ وسعتوں میں

جس قدر تارے ہیں اُس کی اوڑھنی کی

جھلملاہٹ سے بنے ہیں!

یہ ستارے، استعارے ہیں

ہماری آپ کی اس زندگی کا

(جس کے ہونے اور نہ ہونے کے تذبذب میں

ازل سے تا ابد تاریخ کے جالے تنے ہیں)

ستارے سانس لیتے ہیں!

ستارے بھی ہماری آپ کی صورت فضا میں سانس لیتے ہیں

ہماری ہی طرح یہ بھی فنا کی کوکھ میں تخلیق ہوتے ہیں

چمکتے ہیں، دمکتے ہیں، خلا کا رِزق بنتے ہیں!

ہماری آپ کی یہ داستاں تو

ٹوٹتے تاروں کی اِس وحشی چمک کے استعارے

میں سمٹ جاتی ہے لیکن سب ستارے

اتنے بے مایہ نہیں ہوتے!!

کئی مہتاب خُو سورج بکف ایسے بھی ہوتے ہیں

کہ جو خود ٹوٹ بھی جائیں تو اُن کی

روشنی موجود رہتی ہے

صدائے بازگشت اُن کی ہوا کے ساتھ بہتی ہے

وہ اپنی موت سے لوحِ ابد پر زندگی تحریر کرتے ہیں

فنا تسخیر کرتے ہیں!

مرے خوش حال کے نغمے بھی اک ایسے ہی لافانی ستارے
کی ضیا ہیں
مری مٹی کے چہرے کی حیا ہیں!

اِنہی نغموں کے پَرتو سے اُمنگیں جگمگاتی ہیں
اِنہی سے اس زمیں کی آنکھ میں دُلہن کی آنکھیں مسکراتی ہیں
اِسی تارے کی مِشعل سے ہے اپنا تن بدن روشن!
کِرن اندر کِرن روشن!
مرے خوش حال کے نغموں سے ہے میرا وطن روشن!

○

پلکوں کی دہلیز پہ چمکا ایک ستارا تھا

ساحل کی اُس بھیڑ میں جانے کون ہمارا تھا!

کہساروں کی گونج کی صورت پھیل گیا ہے وہ

میں نے اپنے آپ میں چھپ کر جسے پکارا تھا

سر سے گزرتی ہر اک موج کو ایسے دیکھتے ہیں

جیسے اس گردابِ فنا میں یہی سہارا تھا!

ہجر کی شب وہ نیلی آنکھیں اور بھی نیلی تھیں

جیسے اُس نے اپنے سر سے بوجھ اُتارا تھا

جس کی جھلملتا میں تم نے، مجھ کو قتل کیا

پت جھڑ کی اُس رات وہ سب سے روشن تارا تھا

ترکِ وفا کے بعد مِلا تو، جب معلوم ہُوا
اس میں کتنے رنگ تھے اس کے، کون ہمارا تھا

کون کہاں پر جھوٹا نکلا! کیا بتلاتے ہم
دنیا کی تفریح تھی اس میں، ہمیں خسارا تھا

جو منزل بھی راہ میں آئی، دل کا بوجھ بنی
وہ اُس کی تعبیر نہ تھی جو خواب ہمارا تھا

یہ کیسی آواز ہے جس کی زندہ گونج ہوں میں
صبحِ ازل میں کِس نے امجدؔ مجھے پکارا تھا

کیا کبھی تم نے سوچا ہے

جب یونہی بے ارادہ
کبھی باتیں کرتے
مرا ہاتھ اُس کے بدن پر کہیں چُھو سا جائے
تو لگتا ہے جیسے مری اُنگلیوں میں
یکایک بہت سے دیئے جل اُٹھے ہیں

کبھی یونہی جب
باتیں کرتے ہوئے
ایک دم رُک سے جائیں
اور اک دوسرے سے کہیں،
"ہاں تو کیا بات تھی وہ .....
چند لمحے اُسے
یاد کرنے کی ناکام کوشش کریں اور پھر
اس طرح ہنس پڑیں
جیسے باتوں کا مقصد
فقط ایک دوجے کی قربت میں رہنا
اور اُس اجنبی بے تعارف سے لمحے کی آہٹ سے بچنا
ہو جس کے سبب، دل کی دھڑکن کبھی
ایڑیوں اور کبھی، سر سے اس طرح آتی ہے
جیسے یہیں اُس کا مسکن ہو، گھر ہو
یہیں اس کی منزل یہیں رہگزر ہو۔

(۲)

جانِ جاں — میں نے سوچا بہت ہے!
تمھاری قسم،
میں نے اُن سارے لمحوں کو، ژولیدہ لمحوں کے بکھرے ہوئے
موتیوں کو
شب و روز کے بے ٹھکانہ تسلسل کی تسبیح میں
دانا دانا پرویا بہت ہے
(خود کو کھویا بہت ہے)
مگر جب بھی میں اس نشاطِ الم آفریں سے گزرتا.....
گزرنے کی کوشش یا تدبیر کرتا ہوں تو
ایک دیکھا ہُوا بے تعارف سا لمحہ
کوئی اجنبی سا خیال آ کے دامن پکڑتا ہے
میں یاد کرتا ہوں
میں یاد کرنے کی بھرپور کوشش میں

ٹوٹے ہُوئے، ریزہ ریزہ بدن آئینے کی طرح

سارے عکسوں کو ترتیب دیتا ہوں پر

شکل بنتی نہیں

شکل بنتی نہیں اور ژولیدہ لمحوں کے آشوب میں یاد آتا نہیں

مجھ کو کچھ ٹھیک سے یاد آتا نہیں

وہ تعلّق مری رُوح کا عطر تھا

یا فقط جسم کی

بے ٹھکانہ صدا تھی !

تمھاری قسم، اُس سمے کی قسم

مجھ کو کچھ ٹھیک سے یاد آتا نہیں !!

دن بہت جا چکے ہیں اور اب جانِ جاں

تم بھی میری طرح

زندگی کے سب اُس نوع کے تجربوں سے یقیناً گزر آئی ہو

جنھیں لوگ

گم گشتہ جنّت میں گیہوں کے دانے سے نکلی ہوئی
داستاں کے حوالے سے تفسیر کرتے ہیں!
تمھیں بھی .....
(اور اس "تم" سے میں خود کو منفی نہیں کر رہا)
ان حقائق پہ اور اُن کی تفسیر پر پختہ ایمان ہوگا!
مگر جانِ جاں
کیا کبھی تم نے سوچا ہے
وہ لمس کیا تھا!'
جو پوروں میں تارے جگاتا ہوا، مسکراتا ہوا
ازازل تا ابد پھیلتا تھا
(پھیلتا تھا مگر کچھ بتاتا نہ تھا۔ ہاتھ آتا نہ تھا)
اور چُپ کے وہ سب بے کنارا جزیرے
جو باتوں کے بے نام، گہرے سمندر
میں یوں ڈولتے تھے
کہ پورے بدن میں بدن بولتے تھے
وہ کیا تھے!!!

تاریخ

سورج نکلا

اور سورج کے ساتھ درختوں کی شاخوں سے

آوازوں کے پھول کھلاتے طائر نکلے،

حسنِ ازل کے شاعر نکلے!

سورج کا رتھ اپنا چکّر پورا کر کے نکل گیا ہے

لیکن طائر

اس کے سفر کی جھلملتا میں

اپنی سمت گنوا بیٹھے ہیں!!

اپنے خواب لُٹا بیٹھے ہیں!!

شام درختوں کے آنگن میں اُتر رہی ہے،
لیکن اُن سے دور، نہ جانے کتنی دُور
وہ گم کردہ راہ پرندے
(رُکی ہوئی ہے جن کے لبوں پر ایک سلگتی چیخ!
جمی ہوئی ہے جن کے پَروں پر سُورج رَتھ کی دُھول)
تھک کے گرنے کے لمحے میں سوچ رہے ہیں

کل سورج پھر
اُن کے گھروں پر دستک دے گا
اور درختوں کی شاخوں سے، ان کے بچّے
آوازوں کے پھُول کھلاتے نکلیں گے!!!

○

تارا تارا اُتر رہی ہے رات سمندر میں
جیسے ڈوبنے والوں کے ہوں ہاتھ سمندر میں

ساحل پر تو سب کے ہوں گے اپنے اپنے لوگ
رہ جائے گی کشتی کی ہر بات سمندر میں

ایک نظر دیکھا تھا اُس نے، آگے یاد نہیں
کھُل جاتی ہے دریا کی اوقات سمندر میں

میں ساحل سے لوٹ آیا تھا، کشتی چلنے پر
پگھل چکی تھی لیکن میری ذات سمندر میں

کاٹ رہا ہوں ایسے امجدؔ یہ ہستی کی رہ
بے پتوار سی ناؤ پہ جیسے رات سمندر میں

یہ بستی

زندگی بھی مہنگی ہے موت بھی نہیں سستی

یہ زمینِ بے سایہ

گھر گئی خدا جانے کن عجب عذابوں میں

بے وجود سایوں کا یہ جو کارخانہ ہے

کن عجب سرابوں میں کس طرف روانہ ہے

نیستی ہے یا ہستی!

زندگی بھی مہنگی ہے، موت بھی نہیں سستی!

○

لرزش نگہ میں، لہجے میں لکنت عجیب تھی
اس اوّلیں وصال کی وحشت عجیب تھی

روشن ہوئی اُسی سے، اُسی سے بکھر گئی
شبنم کو آفتاب سے نسبت عجیب تھی

آنسو دیئے پر آنکھ کو رونے کی خو نہ دی
اے بادشاہِ غم، یہ عنایت عجیب تھی

کھڑکی میں آکے چاند نے جھپکی نہیں پلک
کل شب مرے مکان میں صحبت عجیب تھی

اِک پل تو جیسے سارا بدن سنسنا اُٹھا
اس سرسری نگاہ میں دعوت عجیب تھی

ساحل پہ تھے تو ریت کا جادو تھا ہر طرف
کشتی چلی تو بحر کی دہشت عجیب تھی

دل میں نہ رہ سکے، جو کہیں تو کہی نہ جائے
امجد شکستِ دل کی حکایت عجیب تھی

اِس بستی کے ہر آنگن میں

ایک ہی جگنو بھٹک رہا ہے تاریکی کے گھیرے میں
ایک ہی تارا چمک رہا ہے چاروں اور اندھیرے میں
ایک ہی سپنا ہمک رہا ہے لاکھوں تھکتی آنکھوں میں
زخمی، خالی ہاتھوں میں

ٹوٹ رہا ہے حلقہ حلقہ زنجیروں کا جال
پگھل رہے ہیں قطرہ قطرہ، گمنامی کے طوق
سمٹ رہا ہے لقمہ لقمہ اس بستی سے کال

○

دشتِ دل میں سراب تازہ ہیں
بجھ چکی آنکھ، خواب تازہ ہیں

داستانِ شکستِ دل ہے وہی
ایک دو چار باب تازہ ہیں

کوئی موسم ہو دل گلستاں میں
آرزو کے گلاب تازہ ہیں

دوستی کی زباں ہوئی متروک
نفرتوں کے نصاب تازہ ہیں

آگہی کے، ہماری آنکھوں پر
جس قدر ہیں عذاب تازہ ہیں

زخم در زخم دل کے کھاتے ہیں
دوستوں کے حساب تازہ ہیں

سر پہ بوڑھی زمین کے امجد
اب کے یہ آفتاب تازہ ہیں

○

جو سرِ دار آ نہیں سکتا
قرضِ ہستی چکا نہیں سکتا

"آج" جس آئینے میں دھندلا ہو
عکس کل کا دکھا نہیں سکتا

ق

لہر ایسی چلی ہے بستی میں
کوئی بھی سر اُٹھا نہیں سکتا

ضبط سے یوں پچنچ رہے ہونٹ
آدمی مسکرا نہیں سکتا

زخمِ بے حرمتی کی کیفیت
کوئی ہونٹوں پہ لا نہیں سکتا

اِتنی گہری ہُوئی ہے تاریکی
آدمی راہ پا نہیں سکتا

رات کے اِس حصار میں، مَیں تو
صبح کے گیت گا نہیں سکتا

کس قدر خواب ہیں نگاہوں میں
جن کو لفظوں میں لا نہیں سکتا

تم نہ دیکھو تمھارا دین ایمان
میں تو نظریں چُرا نہیں سکتا

دل سمندر بھی ہو اگر امجدؔ
پیاس غم کی بُجھا نہیں سکتا

○

اُس نے آہستہ سے جب پکارا مجھے
جُھک کے تکنے لگا ہر ستارا مجھے

تیرا غم، اِس فشارِ شب و روز میں
ہونے دیتا نہیں بے سہارا مجھے

ہر ستارے کی بجھتی ہوئی روشنی
میرے ہونے کا ہے استعارا مجھے

اے خدا، کوئی ایسا بھی ہے معجزہ
جو کہ مجھ پر کرے آشکارا مجھے

کوئی سورج نہیں، کوئی تارا نہیں
تُو نے کس جھٹپٹے میں اُتارا مجھے

عکسِ امروز ہیں، نقشِ دیروز ہیں
اِک اشارا تجھے، اِک اشارا مجھے

ہیں ازل تا ابد ٹوٹتے آئینے
آگہی نے کہاں لا کے مارا مجھے

اطہر نفیس کے لیے ایک نظم

وہ ایک ہمدرد آئینہ تھا
کہ اُس کی آنکھوں میں جو بھی اِک بار دیکھتا تھا
یہ سوچتا تھا،
وہ اب اکیلا نہیں رہا ہے !!
عجب تسلّی بدوش تھیں وہ نگار آنکھیں
وہ زندگی کی اُمید، روشن نوید ایسی بہار آنکھیں
جو سو گئی ہیں !
وہ رتجگوں کے دھوئیں میں لپٹا اُداس چہرہ
مگر وہ آنکھیں
وہ آگہی کی سفیر آنکھیں جو کھو گئی ہیں

وہ جس کے لفظوں میں چاہتوں کے چراغ جلتے تھے

بجھ گیا ہے!

وہ جس کے لہجے میں پھول کھلتے تھے

اُس کی آواز جل گئی ہے

وہ دوستی کا شفیق موسم

وہ روشنی کی لکیر، آگے نکل گئی ہے

وہ اک جزیرہ تھا دوستی کا

جو ہولے ہولے سمندروں کے نمک کی چھریوں سے کٹ رہا تھا

اُلجھتی سانسوں کے زیر و بم میں

وہ روز و شب کے اُداس صفحے اُلٹ رہا تھا

ہماری آنکھوں میں پھیلنے کو سمٹ رہا تھا

اُن جھیل سے گہری آنکھوں میں

اُن جھیل سے گہری آنکھوں میں اک شام کہیں آباد تو ہو!
اُس جھیل کنارے پَل دو پَل
اِک خواب کا نیلا پھول کِھلے

وہ پھول بہا دیں لہروں میں
اِک روز کبھی ہم شام ڈھلے
اُس پھول کے بہتے رنگوں میں
جس وقت لرزتا چاند چلے!

اُس وقت کہیں اُن آنکھوں میں اُس بسرے پل کی یاد تو ہو!
اُن جھیل سے گہری آنکھوں میں اک شام کہیں آباد تو ہو!

پھر چاہے عمرِ سمندر کی
ہر موج پریشاں ہو جائے!
پھر چاہے آنکھ دریچے سے
ہر خواب گریزاں ہو جائے!
پھر چاہے پھول کے چہرے کا
ہر درد نمایاں ہو جائے!

اُس جھیل کنارے پل دو پل وہ رُوپ نگر ایجاد تو ہو!
دن رات کے اِس آئینے سے وہ عکس کبھی آزاد تو ہو!
اُن جھیل سے گہری آنکھوں میں اک شام کہیں آباد تو ہو!

○

لہو میں رنگ لہرانے لگے ہیں
زمانے خود کو دہرانے لگے ہیں

پروں میں لے کے بے حاصل اڑانیں
پرندے لَوٹ کر آنے لگے ہیں

کہاں ہے قافلہ بادِ صبا کا!
دلوں کے پھول مرجھانے لگے ہیں

کھُلے جو ہم نشینوں کے گریباں
خود اپنے زخم افسانے لگے ہیں

کچھ ایسا درد تھا بانگِ جرس میں
سفر سے قبل پچھتانے لگے ہیں

کچھ ایسی بے یقینی تھی فضا میں
جو اپنے تھے وہ بیگانے لگے ہیں

ہوا کا رنگ نیلا ہو رہا ہے
چمن میں سانپ لہرانے لگے ہیں

فلک کے کھیت میں کھلتے ستارے
زمیں پر آگ برسانے لگے ہیں

لبِ زنجیر ہے تعبیر جن کی
وہ سپنے پھر نظر آنے لگے ہیں

کھلا ہے رات کا تاریک جنگل
اور اندھے راہ دکھلانے لگے ہیں

چمن کی باڑ تھی جن کا ٹھکانہ
دلِ شبنم کو دھڑکانے لگے ہیں

بچانے آئے تھے دیوار۔ لیکن
عمارت ہی کو اب ڈھانے لگے ہیں

خدا کا گھر تمھی سمجھو، تو سمجھو
ہمیں تو یہ صنم خانے لگے ہیں

سنو پیارے

سنو پیارے،
محبت کرنے والوں کی نگاہیں بھی
ہوائیں ڈولتی خوشبو کی صورت منظروں میں
اپنے ہونے کی نشانی چھوڑتی ہیں
چاندنی راتوں میں جیسے
چاند کی کرنیں
سمندر کے بدن میں نغمگی آباد کرتی ہیں

محبّت کرنے والوں کے تعلّق اور اُن کی دُوریاں سب سے
انوکھی ہیں

کہ جیسے بے خبر سُورج کے حلقے میں
اگرچہ ان گنت تارے، کئی سیّارگاں ہیں
اور پھر حلقہ بہ حلقہ اُن کے اپنے چاند ہیں لیکن
سبھی اک رشتۂ بے نام کی ڈوری میں ایسے منسلک ہیں
جس طرح عشّاق کی آنکھیں

سنا ہے عورتیں تو
چاہنے والے کی خوشبو
بے کراں انبوہ میں پہچان لیتی ہیں
محبّت کی نظر، ملنے سے پہلے جان لیتی ہیں،
مگر پیارے ....!

○

اگرچہ کوئی بھی اندھا نہیں تھا
لکھا دیوار کا پڑھتا نہیں تھا

کچھ ایسی برف تھی اُس کی نظر میں!
گزرنے کے لیے رستہ نہیں تھا

تمھی نے کون سی اچھائی کی ہے
چلو مانا کہ میں اچھا نہیں تھا

کھُلی آنکھوں سے ساری عمر دیکھا
اِک ایسا خواب جو اپنا نہیں تھا

میں اُس کی انجمن میں تھا اکیلا
کسی نے بھی مجھے دیکھا نہیں تھا

سحر کے وقت کیسے چھوڑ جاتا!
تمھاری یاد تھی، سپنا نہیں تھا

کھڑی تھی رات کھڑکی کے سرہانے
دریچے میں وہ چاند اُترا نہیں تھا

دلوں میں گرنے والے اشک چُنتا
کہیں اک جوہری ایسا نہیں تھا

کچھ ایسی دھوپ تھی اُن کے سروں پر
خدا جیسے غریبوں کا، نہیں تھا

ابھی حرفوں میں رنگ آتے کہاں سے!
ابھی میں نے اُسے لکھا نہیں تھا

تھی پوری شکل اُس کی یاد مجھ کو
مگر میں نے اُسے دیکھا نہیں تھا

برہنہ خواب تھے سورج کے نیچے
کسی اُمید کا پردا نہیں تھا

ہے امجدؔ آج تک وہ شخص دل میں
کہ جو اُس وقت بھی میرا نہیں تھا

ساحل

تمھارے نام کے حرفوں سے بہتر حرف ابجد میں نہیں ہیں
نجانے کب سے یہ موسم
ستاروں کی طرح دھرتی کے سینے پر فروزاں ہیں
مگر ان کی نگاہوں نے
تمھارے وصل کے لمحوں سے بہتر وقت
دیکھا ہے نہ سوچا ہے
ہوا نے منظروں پر آج تک جو کچھ بھی لکھا ہے
تمھارے نام لکھا ہے

خلا میں ٹوٹتے تارے، تمہارے بام سے گزریں

تو رُکنے کو مچلتے ہیں

فلک کو چُومتے جذبے تمہاری آنکھ سے اُتریں

تو پاتالوں میں گرتے ہیں

تمہارے خواب سے روشن منارے

وقت کے دریائے بے حد میں نہیں ہیں

تمہارے نام کے حرفوں سے بہتر حرف ابجد میں نہیں ہیں

آبلہ

اُداسی کے اُفق پر جب تمھاری یاد کے جگنو چمکتے ہیں

تو میری رُوح پر رکھا ہو یہ ہجر کا پتھّر

چمکتی برف کی صورت پگھلتا ہے!

اگرچہ یوں پگھلنے سے یہ پتھّر، سنگریزہ تو نہیں بنتا!

مگر اک حوصلہ سا دل کو ہوتا ہے،

کہ جیسے سرِ بسترِ تاریک شب میں بھی

اگر اک زرد رُو، سہما ہُوا تارا نکل آئے

تو قاتل رات کا بے اسم جادو ٹوٹ جاتا ہے

مسافر کے سفر کا راستہ تو کم نہیں ہوتا

مگر تارے کی چلمن سے

کوئی بھُولا ہُوا منظر اچانک جگمگاتا ہے!

سلگتے پاؤں میں اِک آبلہ سا پھوٹ جاتا ہے۔

○

جو آنسو دل میں گرتے ہیں وہ آنکھوں میں نہیں رہتے
بہت سے حرف ایسے ہیں جو لفظوں میں نہیں رہتے

کتابوں میں لکھے جاتے ہیں دنیا بھر کے افسانے
مگر جن میں حقیقت ہو کتابوں میں نہیں رہتے

بہار آئے تو ہر اک پھول پر اک ساتھ آتی ہے
ہوا جن کا مقدر ہو وہ شاخوں میں نہیں رہتے

لیے پھرتے ہیں کچھ احباب ایسے مضطرب سجدے
جہاں دربار مل جائے جبینوں میں نہیں رہتے

مہک اور تتلیوں کا نام بھونرے سے جُدا کیوں ہے
کہ یہ بھی تو خزاں آنے پہ پھُولوں میں نہیں رہتے

○

کبھی تو دل تمنّاؤں کے اِس گرداب سے نکلے
ہُنر بھی کچھ ہمارے دیدۂ بے خواب سے نکلے

ستارے ٹوٹ کر جیسے خلاؤں میں بکھر جائیں!
ہمارے نام بھی ایسے دلِ احباب سے نکلے

چمن میں گُل بکھرنے پر بھی خوشبو چھوڑ جاتے ہیں!
زمیں کی انجمن سے جو اُٹھے آداب سے نکلے

ابھی تک ان کے بام و دَر پہ اُمیدیں لرزتی ہیں
یہ کن شہروں کے نقشے وادیٔ سیلاب سے نکلے

محبّت کا سخن وہ ہے کہ دشتِ سنگ میں کہیے
تو اس کی بازگشتِ غم دلِ مہتاب سے نکلے

نہ ٹھہرا ایک بھی امجد مری آنکھوں کے ساحل پر
ہزاروں کارواں اس رہگزارِ آب سے نکلے

دو مختصر نظمیں

محبّت

محبت ایسا دریا ہے
کہ بارش روٹھ بھی جائے تو پانی کم نہیں ہوتا

سلام

سدا معتبر،
وہی چند سر،
جو اُگے ہیں شاخِ صلیب پر

ان کہا لفظ

جانِ من،

کل سرِ گفتگو تیری ان خوش نما

وحشی ہرنی سی آنکھوں کے ساحل پہ جو

اک ستارا سا لرزا تھا

وہ رات بھر،

یوں مرے جسم و جاں میں ترا زور رہا

جیسے آنسو نہ تھا۔ نیم کش تیر تھا!

ایک زنجیر تھا

جس کا ہر حلقۂ آہنی

اِس قدر سرد اور مرگ تاثیر تھا

جیسے پھانسی کی شب
جیسے قاتل کا دل
جیسے خنجر کے لب!!

ہاں مری جان وہ قطرۂ شبنمیں
جو تری سرمہ سا
وحشی ہرنی سی آنکھوں میں اِک پل کو لرزا تھا
میرے لیے
جیسے کانٹوں میں الجھی ہوئی اک صدی تھا
ایک ایسی ندی تھا
جو کوہِ الم سے سراسیمہ نکلے
اور افسوس کے دشتِ بے رنگ میں جذب ہو!

جانِ من، یوں تو اِس کُرّۂ ارض پر
سینکڑوں ہی زبانیں، کروڑوں ہی الفاظ ہیں

مگر ہر زباں میں فقط ایک ہی لفظ ہے

جو سدا معتبر ہے

ازل کے تعلّق کا پندار ہے — اُس کا معیار ہے

میں ترے سامنے اُس کو کیسے کہوں

یہ مری خامشی اُس کا اظہار ہے —!

ہاں سنو جانِ من

زندگی کی طرح — آدمی بھی نہایت پُراسرار ہے

کہ جو دیکھو تو ہے

اور نہ دیکھو تو موجِ ہوا کی طرح

ایک پل میں ازل، دوسرے میں ابد

جیسے خوابوں کی حد

جیسے دل کی سند

کل سرِ گفتگو تیری اِن بے صدا

وحشی ہرنی سی آنکھوں میں بھی ایک پل کے لیے

جو ستارا سا چمکا تھا وہ اصل میں
کہکشاں میں پرویا ہُوا لفظ تھا
میرا صدیوں کا کھویا ہُوا لفظ تھا۔

جانِ من!

کُرّۂ ارض پر جس قدر بھی زبانیں اور الفاظ ہیں
اُن کے دامن میں اِس لفظِ بے صَوت سے
خوبصورت کوئی استعارہ نہیں

آسمانِ آسماں،

اِس ستارے سے روشن ستارا نہیں
یہ ازل کے سمندر کی وہ موج ہے
جس کا حدِّ ابد بھی کنارا نہیں۔

اِس وقت جو دریا ہے

ہم تم بھی یہیں ہوں گے، یہ پُل بھی یہیں ہوگا
اِس وقت جو دریا ہے، کل صبح نہیں ہوگا
آنسو کی طرح لمحے، پلکوں پہ لرزتے ہیں
پھر وقت کے دریا میں اس طرح اُترتے ہیں

پہنائی صحرا میں
جس طرح کوئی ذرّہ
بے نام ونشاں ہو جائے
ہونے کا گماں ہو جائے

یہ جمتا ہُوا آنسو — یہ ٹھہرا ہُوا لمحہ

اک جھیل سی ہے جس میں

اِک وصلِ رمیدہ کے کچھ پھُول مہکتے ہیں۔ کچھ عکس لرزتے ہیں

یہ عکس لرزنے دے۔ یہ پھُول مہکنے دے!

اس جھیل کے ساحل پر اس چاند کو چلنے دے!

آنکھوں سے گرا آنسو ٹوٹا ہُوا پرچم ہے،

ساحل کے اُدھر ہر سُو اِک ہجر کا موسم ہے

اس ہجر کے موسم میں

یہ جھیل کہیں ہو گی، یہ چاند کہیں ہو گا!

اس وقت جو دریا ہے! کل صبح نہیں ہو گا!!

○

کبھی رقصِ شامِ بہار میں اُسے دیکھتے!
کبھی خواہشوں کے غبار میں اُسے دیکھتے!

مگر ایک نجمِ سحر نما، کہیں جاگتا،
ترے ہجر کی شبِ تار میں اُسے دیکھتے

وہ تھا ایک عکس گریز پا، سو نہیں رُکا
کٹی عمر دشت و دیار میں اُسے دیکھتے

وہ جو بزم میں رہا بے خبر، کوئی اور تھا
شبِ وصل میرے کنار میں اُسے دیکھتے

جو ازل کی لوح پہ نقش تھا، وہی عکس تھا
کبھی آپ قریۂ دار میں اُسے دیکھتے

وہ جو کائنات کا نور تھا، نہیں دور تھا
مگر اپنے قرب و جوار میں اُسے دیکھتے

یہی اب جو ہے یہاں نغمہ خواں، یہی خوش بیاں
کسی شام کوئے نگار میں اُسے دیکھتے

یہ جو ریگِ دشتِ فراق ہے

یہ جو ریگِ دشتِ فراق ہے یہ رُکے اگر

یہ رُکے اگر تو نشاں ملے ۔ یہ نشاں ملے

کہ جو فاصلوں کی صلیب ہے

یہ گڑی ہُوئی ہے کہاں کہاں !

مرے آسماں سے کدھر گئی ترے التفات کی کہکشاں

مرے بے خبر، مرے بے نشاں

یہ رُکے اگر تو پتہ چلے

میں تھا کس نگر تُو رہا کہاں !

کہ زماں مکاں کی یہ وسعتیں
تجھے دیکھنے کو ترس گئیں
(وہ مرے نصیب کی بارشیں
کسی اور چھت پہ برس گئیں!)

مرے چار سُو ہے غبارِ جاں، وہ فشارِ جاں
کہ خبر نہیں مرے ہاتھ کو مرے ہاتھ کی
مرے خواب سے ترے بام تک
تری رہگزر کا تو ذکر کیا
نہیں ضَو فشاں ترا نام تک!
ہیں دھواں دھواں، مرے استخواں
مرے آنسوؤں میں بجھے ہوئے مرے استخواں
مرے نقش گر، مرے نقشِ جاں

اسی ریگِ دشتِ فراق میں رہے منتظر۔ ترے منتظر
مرے خواب، جن کے فشار میں

رہی میرے حال سے بے خبر

تری رہگزر

تری رہگزر کہ جو نقش ہے مرے ہاتھ پر
مگر اس بلا کی ہے تیرگی
کہ خبر نہیں مرے ہاتھ کو مرے ہاتھ کی
وہ جو چشمِ شعبدہ ساز تھی وہ اُٹھے اگر
مرے استخواں میں ہو روشنی
اُسی ایک لمحۂ دید میں تری رہگزر
میری تیرہ جاں میں چمک اُٹھے
مرے خواب سے ترے بام تک
سبھی منظروں میں دمک اُٹھے
اُسی ایک پل میں ہو جاوداں
مری آرزو کہ ہے بے کراں
مری زندگی کہ ہے مختصر
یہ جو ریگِ دشتِ فراق ہے یہ رُکے اگر ۔۔ !

○

کسی کی آنکھ میں خود کو تلاش کرنا ہے
پھر اِس کے بعد ہمیں آئنوں سے ڈرنا ہے

فلک کی بند گلی کے فقیر ہیں تارے !
کہ گھوم پھر کے یہیں سے انھیں گزرنا ہے

جو زندگی تھی مری جان! تیرے ساتھ گئی
بس اب تو عمر کے نقشے میں وقت بھرنا ہے

جو تم چلو تو ابھی دو قدم میں کٹ جائے
جو فاصلہ مجھے صدیوں میں پار کرنا ہے

تو کیوں نہ آج یہیں پر قیام ہو جائے
کہ شب قریب ہے، آخر کہیں ٹھہرنا ہے

وہ میرا سیلِ طلب ہو کہ تیری رعنائی
چڑھا ہے جو بھی سمندر، اُسے اُترنا ہے

سحر ہُوئی تو ستاروں نے مُوند لیں آنکھیں
وہ کیا کریں کہ جنھیں انتظار کرنا ہے

یہ خواب ہے کہ حقیقت، خبر نہیں امجد
مگر ہے جینا یہیں پر، یہیں پہ مرنا ہے

○

زندگانی، جاودانی بھی نہیں
لیکن اس کا کوئی ثانی بھی نہیں

ہے سوا نیزے پہ سورج کا عَلَم
تیرے غم کی سائبانی بھی نہیں

منزلیں ہی منزلیں ہیں ہر طرف
راستے کی اِک نشانی بھی نہیں

آئینے کی آنکھ میں اب کے برس
کوئی عکسِ مہربانی بھی نہیں

آنکھ بھی اپنی سراب آلود ہے
اور اس دریا میں پانی بھی نہیں

جُز تحیّر، گردبادِ زیست میں
کوئی منظر غیر فانی بھی نہیں

درد کو دلکش بنائیں کس طرح!
داستانِ غم، کہانی بھی نہیں

یوں لُٹا ہے گلشنِ وہم و گماں
کوئی خارِ بدگمانی بھی نہیں

○

زندگی درد بھی دوا بھی تھی
ہم سفر بھی گریز پا بھی تھی

کچھ تو تھے دوست بھی وفا دشمن
کچھ مری آنکھ میں حیا بھی تھی

دن کا اپنا بھی شور تھا لیکن
شب کی آواز بے صدا بھی تھی

عشق نے ہم کو غیب دان کیا
یہی تحفہ، یہی سزا بھی تھی

گردبادِ وفا سے پہلے تک
سر پہ خیمہ بھی تھا رِدا بھی تھی

ماں کی آنکھیں چراغ تھیں جس میں
میرے ہمراہ وہ دعا بھی تھی

کچھ تو تھی رہگزر میں شمعِ طلب
اور کچھ تیز وہ ہوا بھی تھی

بے وفا تو وہ خیر تھا امجدؔ
لیکن اُس میں کہیں وفا بھی تھی!

تم

تم جس خواب میں آنکھیں کھولو
اس کا روپ امر
تم جس رنگ کا کپڑا پہنو
وہ موسم کا رنگ
تم جس پھول کو ہنس کر دیکھو
کبھی نہ وہ مرجھائے
تم جس حرف پہ اُنگلی رکھ دو
وہ روشن ہو جائے

جب

جب شب کے شکستہ زینوں سے مہتاب اُترنے لگتا ہے
جب غم کے سرد الاؤ میں امیدیں بجھنے لگتی ہیں،
جب دل کے شوہ سمندر میں آوازیں مرنے لگتی ہیں،

جب موسم ہاتھ نہیں آتے جب تتلی بات نہیں کرتی
جب زندہ رہنا اِک بے معنی کام دکھائی دیتا ہے
جب آنے والا ہر لمحہ دشنام دکھائی دیتا ہے

جب یاد کے گہرے سناٹے میں چہرے گم ہو جاتے ہیں
جب درد سے بوجھل آنکھوں میں گرداب سے پڑنے لگتے ہیں
جب شمعیں گل ہو جاتی ہیں جب خواب بکھرنے لگتے ہیں
اس وقت اگر تم آجاؤ!!

○

آنکھوں سے اک خواب گزرنے والا ہے
کھڑکی سے مہتاب گزرنے والا ہے

صدیوں کے ان خواب گزیدہ شہروں سے
مہرِ عالم تاب گزرنے والا ہے

جادوگر کی قید میں تھے جب شہزادے
قصّے کا وہ باب گزرنے والا ہے

ق

سنّاٹے کی دہشت بڑھتی جاتی ہے
بستی سے سیلاب گزرنے والا ہے

دریاؤں میں ریت اُڑے گی صحرا کی
صحرا سے گرداب گزرنے والا ہے

مولا جانے کب دیکھیں گے آنکھوں سے
جو موسم شاداب گزرنے والا ہے

ہستی امجدؔ دیوانے کا خواب سہی
اب تو یہ بھی خواب گزرنے والا ہے

تم سچّے برحق سائیں

تم سچے برحق سائیں

سر سے لے کر پیروں تک

دنیا شک ہی شک سائیں

تم سچّے، برحق سائیں

اِک بہتی ریت کی دہشت ہے،

اور ریزہ ریزہ خواب مرے

بس ایک مسلسل حیرت ہے

کیا ساحل، کیا گرداب مرے!

اس بہتی ریت کے دریا پار
کیا جانے ہیں کیا کیا اسرار!
تم آقا چاروں طرفوں کے!
اور میرے چار طرف دیوار
اِس دھرتی سے افلاک تلک
تم داتا، تم ہو پالنہار
میں گلیوں کا گکھ سائیں
تم سچّے برحق سائیں
سر سے لے کر پیروں تک
دنیا شک ہی شک سائیں!

۲

کچھ بھید ازل سے پہلے کا!
کچھ راز ابد کی آنکھوں کے!
کچھ قصّہ ہجر سراپے کا
کچھ بھیگے موسم خوابوں کے!

کوئی چارہ میری پستی کا

کوئی دارو آنکھ ترستی کا

بس ایک نظر سے جڑ جائے

آئینہ میری ہستی کا

ازلوں سے راہیں تکتا ہے

اک موسم دل کی بستی کا

اس کی اور بھی تک سائیں

تم سچے برحق سائیں

سر سے لے کر پیروں تک

دنیا شک ہی شک سائیں!

تم سچے برحق سائیں

۳

میں ایک بھکاری لفظوں کا

یہ کاغذ ہیں کشکول مرے

ہیں ملبہ زخمی خوابوں کا

یہ رستہ بھٹکے بول مرے

یہ ارض و سما کی پہنائی

یہ میری ادھوری بینائی

کیا دیکھوں، کیسے دیکھ سکوں!

یہ، ہجر کی جلوہ آرائی،

یہ رستہ کالے کوسوں کا

اور ایک مسلسل تنہائی

مانگوں ایک جھلک سائیں

تم سچّے برحق سائیں

سر سے لے کر پیروں تک

دنیا شک ہی شک سائیں

تم سچّے برحق سائیں!

روشن آنکھیں

(منظوم ڈرامہ)

بوڑھا کسان :

کسان ہوں میں

ازل سے اب تک زمیں کے سینے میں رزق بونا

مرا مقدر رکھا گیا ہے

تمام موسم مرے لیے موسم سزا ہیں

مرے گرسنہ اُداس بچے دمکتی فصلوں کو دیکھتے ہیں

تو پوچھتے ہیں

" اگر یہ فصلیں تمہاری محنت سے خون لے کر

جواں ہوئی ہیں

تو اُن کا جوبن ہمارے گھر کے بجائے گاؤں

کی سب سے اُونچی سیہ حویلی کا نُور کیوں ہے!

جوان دُلہن سی فصل جس کو

ہوا کا جھونکا جو چُھو کے گزرے تو کانپتی ہے

ہمارے ہاتھوں سے دُور کیوں ہے!"

میں اپنے بچوں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں

یہ کن گناہوں کے سلسلے میں مرے حوالے کیے گئے ہیں

کہ ان کی قسمت میں بھوک لکھی ہے اور مجھ کو

زمیں کے سینے میں رزق بونے کا کام بخشا

گیا ہے تاکہ مری ہی محنت مرے لیے دُور کی صدا ہو

سوال جی میں اُٹھیں کچھ ایسے کہ سننے والا بہت خفا ہو

گیت

خدائے برتر

جو کچھ ہے

تُو ہے

تری مشیّت وہ لفظِ اوّل ہے جس کا آخر

تو آپ ہی ہے

تو ایسا رازق ہے جس کے دستِ عطا سے بہتّر

ہیں بندگیر طے کی زندگی ہے

تجھے یقیناً یہ علم ہوگا

کہ اس زمیں پر کچھ ایسی بدبخت بستیاں بھی ہیں جن کے باسی

تری توجہ کے خواب قریے میں جی رہے ہیں

تری توجہ کا خواب قریہ جہاں اندھیرا ہی روشنی ہے

مجھے بتا ان گرسنہ نسلوں کا جرم کیا ہے

یہ کس سے اپنے گناہ پوچھیں

جو اپنے رستے سے بے خبر ہوں!

وہ کس طرح تیری راہ پوچھیں!

خدائے برتر ــــ خدائے برتر

(گیت کے اختتام پر ایک نوجوان کسان چہرے پر ایک
عزم کی تمازت لیے آتا ہے)

نوجوان کسان

خدائے برتر، تری زمیں پر

یہ راہ بھولا ہوا قبیلہ کسی ٹھکانے کو ڈھونڈتا ہے

کوئی ٹھکانہ

جہاں حفاظت، سکون، راحت

متاعِ محنت کا اجر، رنگِ گلِ تمنّا کی سبز خوشبو

مشامِ جاں کو بہار کر دے

کوئی ٹھکانہ، خدائے برتر

جہاں پہ طاقت وروں کی طاقت

تونگروں کی تجوریوں میں کھنکتے سکّے

کسی کی عزت کی سمت میلی نظر سے تکتی ہوئی نگاہوں

کا خوف سایہ نہ راہ پائے

زمین کا مالک وہی ہو جس کے جوان بازو

پسینہ بن کر چمکتی محنت سے خشک مٹی میں بیج بوئیں

وہی زمینوں سے اُٹھنے والی حسیں مہک کو
بدن سے اُٹھتی ہوئی مہک سے ملا کے نکلے
جو گرمیوں کی
لہو جلاتی ہوئی ہواؤں میں ہل چلائے
بدن کو ڈستے ہوئے زمستاں کی کہر افشاں فضا میں
کھیتوں کی آبیاری کو گھر سے نکلے
زمیں پہ حق ہو اسی بشر کا
جو اپنے ہاتھوں سے خشک مٹی
کو سبز کھیتوں کا رنگ بخشے

گیت

(اقبال)

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے سحاب

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب

موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

دِہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں

تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

(ایک اُونچے شملے، چڑھی ہوئی مونچھوں خشونت زدہ چہرے والا چودھری
آنکھیں لال پیلی کرتا ہُوا داخل ہوتا ہے)

چودھری :

تری یہ جرأت، تو میرے کھیتوں پہ حق جتائے

تجھے خبر ہے کہ تیرے جیسے کئی مزارعے

مری نگاہوں کے اک اِشارے پہ میرے تلووں کو چاٹتے ہیں

مری زمیں ہے، مرے لیے اس پہ کام کرنا

تمھارے جینے کا راستہ ہے

اگر میں تم کو یہاں نہ رکھتا

تو اور کوئی مرے لیے اس پہ کام کرتا

مگر زمیں کا وجود قائم ہے اور دائم

رہے گا میں اور میرے بچے

ابد تلک اس کی بخششوں کا خراج لیں گے

کہ سارے مالک خراج لیتے ہیں

ہاتھ باندھو!

جھکاؤ سر کو!

بھکاریوں کی طرح ترستی ہوئی نگاہوں میں اشک بھر کے

مری حویلی کی خیر مانگو

اگر کسی نے مری حویلی کے گرد لہجہ بلند کر کے صدا لگائی

تو یاد رکھو

میں اُن زبانوں کو کاٹ دیتا ہوں جن کے مالک

مری حکومت سے بے خبر ہوں

(چودھری کے آخری مکالمے کے دوران موسیقی کی آواز آتی ہے۔ کیمرہ آہستہ آہستہ ترنجن پہ آتا ہے جہاں لڑکیاں غم آلود لہجے میں گا رہی ہیں)

گیت

درِ طلسمِ صدا کھلے تو اسے پکاریں

کہ اس کے ہاتھوں میں خواہشوں کا قبول رد ہے

اسے دکھائیں کہ کتنے بادل

ہمارے کھیتوں سے بے تعلق نکل گئے ہیں

اسے بتائیں کہ کتنی کلیاں

کشادہ ہونے کی آرزو میں بکھر گئی ہیں

رلائیں اس کو ان آنسوؤں پر

جو خشک آنکھوں میں کھو گئے ہیں

درِ طلسمِ صدا کھلے تو اسے پکاریں

بوڑھا کسان:

مرے خدایا کہاں تلک یہ عذاب جھیلیں

کہاں رکے گا یہ کاروانِ سیاہ قسمت!

اخیر ہوں گی کہاں پہ آخر

یہ دکھ کی بوجھل طویل راتیں

کبھی کبھی تو قریب لگتی ہیں آنے والے دنوں کی باتیں

گماں لگتی ہیں اپنی ذاتیں

مرے خدایا کوئی بشارت — کوئی بشارت مرے خدایا

——— مرے خدایا

نوجوان :

بشارتوں کا ورود اُن کے لیے نہیں ہے

جو منتظر ہیں

سکوں کی منزل خود آپ چل کے قریب آئے

حصولِ منزل بنا سفر کے نہ ہو سکا ہے کبھی نہ ہوگا

مسافروں کے لیے سفر کا شعور لازم

بوڑھا :

مگر ہمارے لیے تو رستے بھی منتخب ہیں

تمھیں پتا ہے سوال کرنے کی کیا سزا ہے

نوجوان :

عذاب جو ہم پہ آ رہے ہیں

تمام دُنیا کی سب سزاؤں سے سخت تر ہیں

میں بُزدلی کی حیات جی جی کے تھک گیا ہوں

میں آنسوؤں کے ایاغ پی پی کے تھک گیا ہوں

میں زندہ رہنے کی طرح زندہ رہوں گا میرا یہ فیصلہ ہے

میں جانتا ہوں سوال کرنے کی کیا سزا ہے !

بوڑھا

مگر وہ آقا

جو کتنی نسلوں سے ان زمینوں کا حکمراں ہے بگڑ گیا تو

ہماری جانوں کا کیا بنے گا

نوجوان :۔ (طنزیہ انداز میں ہنستا ہے) ـــــ

ہماری جانیں ـــــ '

مرے مکرم ہماری جانیں تو اس کی نظروں میں خشک مٹی کی ڈھیریاں ہیں

جو ہوں تو کیا ہے نہ ہوں تو کیا ہے!

سنو! فضاؤں میں حوصلوں کی نوید ہم کو بلا رہی ہے

ہوا ترانے سنا رہی ہے

گیت

یہ ہوائے آخرِ شب ہے سحر آنے کو ہے

آرزو کے زرد لہجے میں اثر آنے کو ہے

پاسکیں گے بونے والے اپنی محنت کا ثمر

سیپیوں کی آستینوں میں گہر آنے کو ہے

ختم ہو جائے گا اب یہ سلسلۂ بے نشاں

شوق کی منزل، وفا کی رہگزر آنے کو ہے

(میوزک کا تیز: BANG سیاہیوں سے روشنی پھوٹنے لگتی ہے۔ نوجوان کا

چہرہ فرطِ مسرت سے تمتما رہا ہے)

نوجوان :

زمیں کی آنکھیں

جوان جذبوں کی روشنی سے دمک رہی ہیں

اب اس زمیں سے جو کچھ اُگے گا

وہ ظالموں کی بجائے اُن کو وصول ہو گا

جو اپنی محنت سے اس سے اس کو تخلیق کر رہے ہیں

یہ سردیوں کے خُنک سویرے

یہ گرمیوں کے تنور موسم

دمکتی فصلوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں کے سبز ہاتھوں کو چُومتے ہیں

ہوائیں ان کے گھروں میں بکھری ہوئی گھٹن کو

سکوں کی خوشبو سے بھر رہی ہیں

نرنجنوں میں کھنکتے لہجے نئے دنوں کی نوید پاکر چمک رہے ہیں

گلاب سینوں میں آنے والے بہار موسم مہک رہے ہیں

دلوں کی دھڑکن میں چوڑیوں کی کھنک بسی ہے

سہیلیوں کے مذاق آنکھوں میں اُلجھنوں کے حسیں دُھندلکے

بنا کے سانسوں میں پھیلتے ہیں

اور آہٹوں کو مسافروں کے وجود دے کر

سُلگتی شاموں میں جاگتے ہیں

لبوں پہ نغمے مچل رہے ہیں

[ترنجن کا منظر جہاں لڑکیاں "سمی" گا رہی ہیں]

بوڑھا کسان :

جواں ارادے نئی رُتوں سے قدم ملا کے نئے سفر کی طرف چلے ہیں

دمکتی فصلوں کا رُوپ منزل کا آئینہ ہے

وطن کی منزل

جو پکّی فصلوں کی مثل محنت کشوں کو اپنی

جبینِ روشن دکھا رہی ہے

نوجوان :

کہاں گئے وہ پرانے آقا

خراج لیتے تھے جو غریبوں کی بے کسی کا

خراج لیتے تھے ان کی محنت کا، ان کی آنکھوں کی روشنی کا

تر نجنوں میں جوان ہوتے ہوئے خیالوں کی دل کشی کا

بوڑھا:

حویلیوں کے نواح بڑھتی ہوئی صداؤں سے گونجتے ہیں

مگر جو خوشبو کے راستے میں فصیل ہونے کے مدّعی تھے

ہوا کے جھونکوں سے ڈر رہے ہیں

بدل رہا ہے جہانِ کہنہ جہانِ تازہ اُبھر رہا ہے

زمیں کا چہرہ نکھر رہا ہے

کورس

زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے

بکھر رہی ہے فصیلِ ظلمت، وفا کا سورج نکل رہا ہے

نظر میں جذبے جواں ہوئے ہیں، دلوں میں دریا اُچھل رہا ہے

زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے

بڑھا ہے محنت کشوں کا لشکر

ہلوں کی ہتھی پہ ہاتھ رکھ کر

اُداس کھیتوں پہ بچھ رہی ہے

دمکتی فصلوں کی چاند چادر

کرے جو محنت وہی ہے مالک

حویلیوں کا نہیں رہا ڈر

چلو فضاؤں کا ذرہ ذرہ حسین رنگوں میں ڈھل رہا ہے

زمیں کا نقشہ بدل رہا ہے

امجد اسلام امجد

کی تصنیفات

۱- برزخ — نظمیں ۱۹۷۴ء

۲- عکس فلسطینی نظموں کے منظوم تراجم (انعام یافتہ) ۱۹۷۶ء

۳- ساتواں در نظمیں، غزلیں ۱۹۷۶ء

۴- وارث- ٹی وی ڈرامہ سیریل ۱۹۸۰ء

۵- کالے لوگوں کی روشن نظمیں

نیگرو نظموں کے تراجم ۱۹۸۱ء

۶- دہلیز- ٹی وی ڈرامہ سیریل ۱۹۸۱ء

۷- فشار — شاعری ۱۹۸۲ء

۸- نئے پرانے — کلاسیکی

اُردو شاعری کی تنقید اور انتخاب (زیرِ ترتیب)

۹- خواب جاگتے ہیں

منتخب ٹی وی ڈرامے (زیرِ ترتیب)

فشار
امجد اسلام امجد